۔ راحیل مسلمان ہو گیا۔ رعد جنّی کو ایک اور کاری ضرب لگی وہ غصّہ سے آگ بگولہ ہو گیا اور واویلا کرنے لگا ؎

دیکھا رعد جو اپنے بیٹے کو یوں ۲م لگیا بولنے مار سینے کو یوں
سو ریش آپنا نوچ[1] لینے لگیا ۳م جو لہو انجو[2] پونچھ لینے لگیا
کہا ہائے ہائے دیکھو کیوں ہوا ۴م کہ بیٹا مرا جا مسلماں ہوا

رعد جنّی کے نو لاکھ سپاہیوں نے شیر خدا اور راحیل کو گھیر لیا اور تیروں وغیرہ کی بوچھاڑ کر دی۔ یہاں تک کہ زمین و آسمان پناہ مانگنے لگے ؎

لگے مارنے گرز تیر و تفنگ ۵م جو باناں فرنگ کا ربوبی(؟) ہور سنگ
جو یوں دیکھ ہو گھابرا آسمان ۶م زمیں تھر تھرا کر اٹھی کر فغاں

علی مرتضیٰ نے اسم اعظم اور ذوالفقار کی مدد سے رعد جنّی کی نو لاکھ فوج کو مسل کر رکھ دیا ؎

جو لشکر کوں جا کر گئے زن کہنڈل ۷م گئے نہاٹ سارے پلید انکے دل

بالآخر رعد جنّی بھی مقابلے پر اُتر آیا اور انجام کار رعد جنّی کی عبرتناک موت ہوئی۔ حضرت علی نے راحیل کو رعد کی حکومت سونپ دی اور کلمۂ طیبہ کے عوض سارے جنات کو بھی بخش دیا۔ حضرت علیؑ اس غار اور جنگل سے بخیر و خوبی لوٹ آئے۔ اس ضعیف شخص اور ضعیفہ نے سارا ماجرا بہ چشم خود دیکھا اور مسلمان ہو گئے ؎

دیکھے یوں تماشا ہو ربڈی نیں بھر ۸م اپن دوستاں سو سکھے کھول کر

---

[1] نوچ [2] آنسو

سو دھر صدق شہ پر ایماں لائے ۴۹ توں کفر کی راہ او دین پائے

مثنوی کے آخری اشعار میں بھی اس کے فارسی ماخذ اور سنہ تصنیف پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ ان اشعار سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ یہ نظم ابوالحسن تاناشاہ کے آخری ایام سلطنت میں لکھی گئی۔ کیوں کہ اسی سنہ میں اورنگ زیب عالمگیر نے گولکنڈہ پر فتح پائی اور قطب شاہی سلطنت کا خاتمہ ہو گیا۔ شاعر نے اپنے نام اور لقب کی صراحت بھی انھیں اشعار میں کی ہے۔ ملاحظہ ہو ؎

یو قصہ اتھا فارسی ہوں اول ۵۰ جو معنی بکٹ ہور او کل کبل
خدا ہور محمد علی کا سے نام ۵۱ کیا فارسی کوں سو دکھنی تمام
ہوئے خام بیوں سارے عالم کے تئیں ۵۲ بہر حال سیتے گیا اسکوں میں
نہ شاعر ہوں میں ہور نہ شاعری ۵۳ نہ منعم ہوں میں ہور نہ سامری
اپن طبع کے حجاڑ کے خیال کوں ۵۴ بہر حال لایا ہوں میں بار کوں
کہ خوب ہے ہور کیں خام ہے ۵۵ تمن عارفاں کا نج انعام ہے
کہ ہجرت کے بعد از سنہ سال پر ۵۶ ہزار و نود ہور شش سال پر

(سنہ ۱۰۹۶ھ مطابق جولائی اگست ۱۶۸۵ء)

کہ ماہِ مبارک ہور رمضان تھا ۵۷ امت کوں محمد کی ہور ماں تھا
جو اس مہینے یو مرتب کیا ۵۸ گرا و اپنے مہینے سے آگہ کیا
اتھا اس وقت بوالحسن بادشاہ ۵۹ خلق اسکوں بولے حسن قطب شاہ
کہ لیں کے زمانے منے یو کیا ۶۰ تمن عاشقاں سیں دعا منگ لیا
لقب دے کتے منج کوں منصور کر ۶۱ ولے نام میرا ہے آدم گکر

سنہ کتابت بے فی التاریخ تحریر ۲۲ شہر شوال ۱۱۸۰ھ (۲۶ ر دسمبر ۱۷۶۶ء) روزے دو شنبہ دراول پاس در بندر میلا پور (مدراس) کاتب غیاث - oooo

مولانا ابوالکلام آزادؒ

ایک جائزہ

از جناب محمد شعیب صاحب عمری بنگلور

(۲)

(۷) مولانا آزاد کی تحریر کی ایک خصوصیت طنز نگاری ہے۔ اس صنف میں انھیں غیر معمولی ملکہ حاصل تھا۔ انھوں نے اپنے کمالِ نگارش سے اس طرز میں ایک عجیب دلربایانہ شان پیدا کی، اور اس کے دامن کو گلہائے رنگارنگ سے بھر دیا۔ ان کی طنز نگاری ایک طرف حسین و دلکش الفاظ، نادر اور بدیع تراکیب، رقصاں و درخشاں تشبیہات، لطیف اور خنداں استعارات اور دل ربا و رعنا اشارات و کنایات کی جلوہ گاہ ہوتی ہے تو دوسری طرف اس میں اس غضب کا اثر و نفوذ ہوتا ہے کہ وہ آنِ واحد میں دماغ کی قوتوں کو چھو کر دل کی گہرائیوں میں اتر جاتی ہے۔ نیز مولاناؒ کے اس "رنگین، باوقار، مہذب، شستہ و شگفتہ نگارش کے ایک ایک لفظ میں تیر و نشتر مخفی ہوتے ہیں، وہ خنجر کی نوک اور تلوار کی دھار سے زیادہ تیز ہوتے ہیں جن خوش قسمت افراد کو مولاناؒ کے اس تیغِ طنزیات کے قتیل ہونے کا شرف حاصل ہے، وہ بخوبی جانتے ہیں کہ اس طرزِ نگارش کی "لذت" سے انھیں کس قدر "حظ" حاصل ہوا اور اپنے زخم خوردہ دل کے کرب سے کس قدر "الم" نصیب ہوا۔

یوں تو طنز نگاری کی مثالیں الہلال کے متعدد مضامین میں بکثرت ملتی ہیں، لیکن مسلم یونیورسٹی فونڈیشن کمیٹی کے ایک جلسہ کے سلسلہ میں مولانا آزاد اور مولانا محمد علی مرحوم کے درمیان کچھ ناگواری پیدا ہوگئی تھی۔ مولاناؒ نے ۹ فروری، ۲۶ فروری، ۱۳ مارچ اور ۲ اپریل کے الہلال میں "حدیث الغاشیہ" کے زیرِ عنوان اس تعلق سے جو کچھ تحریر فرمایا ہے، وہ اس نوع کی نہایت تابناک مثال ہے۔ نیز عصرِ حاضر

کے ادیب اور امام طنزیات مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی نے ۱۹۱۳ء میں ایک نئی اصطلاح یعنی "حظ" بمعنی "لذت" اور "کرب" بمعنی "الم" وضع کر کے مولانا آزاد سے نوعمری کے جوش میں اُلجھ پڑے تھے۔ مولانا آزاد نے اس بحث و جدال کے جواب میں الہلال مورخہ ۱۷ ستمبر اور یکم اکتوبر ۱۹۱۳ء میں جو کچھ ارقام فرمایا ہے وہ ادبیاتِ نثر میں نہایت عالی شان باب کی حیثیت رکھتا ہے۔ چنانچہ اس قدیم نزاع پر مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی رقم طراز ہیں :۔

"مولانا شبلی نے میرا ایک آدھ مضمون (انگریزی سے ترجمہ) الندوہ کے لئے لکھا گیا تھا، الہلال کی طرف منتقل کر دیا، اس کی تاب میں نہ لا سکا، اور طبیعت جو اس نوعمری کے جوش میں بحث و جدال کے لئے بہانہ ڈھونڈ رہی تھی، کچھ یہی روز اول بعض اصطلاحات علمی کی آڑ میں صاحبِ الہلال سے اُلجھ ہی پڑی، دو چار مضمون خوب گرما گرم نکلے، وہ تو خدا بھلا کرے ایک فاضل ندوی دوست کا جنھوں نے درمیان میں پڑ کر یہ سلسلہ رکوا دیا، ورنہ نوبت خدا جانے کہاں تک جا پہونچتی۔"

(صدق جدید "چند یادیں" مورخہ ۲۳ مارچ ۱۹۵۸ء)

چونکہ طنز نگاری مولانا آزاد کی سیرت کی بلندی اور کردار کی پاکیزگی سے کوئی مناسبت نہیں رکھتی تھی، لہٰذا انھوں نے اس طرز نگارش کو اپنے گہربار قلم کی جولانیوں سے محروم کر دیا۔ مولانا نے ۱۹۱۳ء میں جو عہد کیا تھا اس پر تاحین حیات قائم رہے، یعنی انھوں نے کو صبر و وقار اور پیکر تسلیم و رضا بن کر مخالفین، معاندین اور حاسدین سے سب و شتم، طنز و مزاح اور طعن و تشنیع سب کچھ سننے کے باوجود اپنی زبانِ صدق بیان سے کبھی کوئی ناگوار لفظ نہ نکالا۔ چنانچہ ۱۹۱۳ء کے بعد ان کی کتاب زندگی کے اوراق شاہد ہیں کہ ان میں طنز ہے نہ تضحیک، ہجو ہے نہ اظہار حقارت کے کلمات ہیں نہ تمسخر کے الفاظ۔ ایک مشہور عالم دین مولانا محمد ابراہیم صاحب سیالکوٹی مرحوم نے مولانا کی تفسیر سورۂ فاتحہ کے چند حصوں پر مناظرانہ انداز میں اعتراضات کئے تھے۔ اسی سلسلہ میں مولانا [illegible] مرحوم نے [illegible] صاحب سے [illegible] اور لکھا کہ آپ نے کتاب [illegible]

بھجوا دوں؟ اس کے جواب میں مولاناؒ نے تحریر فرمایا :-

" چونکہ آپ لکھتے ہیں کہ کسی وجہ سے انھوں نے مناظرانہ اسلوب اختیار کیا ہے، اس لئے براہِ عنایت مجھے کتاب نہ بھیجئے، میرا نہ دیکھنا ہی بہتر ہے، ۱۹۱۸ء سے میں نے جن باتوں کا عہد کیا ہے، ان میں سے ایک یہ ہے کہ کسی شخص کو جو مناظرانہ طریق پر میرے خلاف کچھ لکھے گا، نہ تو جواب دوں گا، نہ اس کی شکایت سے اپنے نفس کو آلودہ ہونے دوں گا۔"

(نقشِ آزاد صفحہ ۱۵ مکتوب نمبر ۲۴ مورخہ ۱۵ جنوری ۱۹۳۶ء)

پنجاب کے ایک سیاست داں نے اپنے ایک بیان میں چند ایسی باتیں کہیں جو بے اصل تھیں، مولانا آزادؒ نے مولانا غلام رسول مہرؔ مرحوم کو اس تعلق سے جو کچھ تحریر فرمایا ہے، ملاحظہ کیجئے اور غور فرمائیے کہ موجودہ دَور میں طہارتِ نفس کی اس سے بہتر مثال کہیں مل سکتی ہے؟

" اگر میری طبیعت کا وہ انداز ہوتا، جو اس وقت تھا جب الہلال نکلتا تھا تو یہ صریح کذب ہے کہ نہیں معلوم کس عالمِ بیان میں میرے قلم سے کس درجہ سخت الفاظ اس شخص کی نسبت نکل جاتے، لیکن اب میرا حال دوسرا ہے، کوئی شخص کتنے ہی قبیح فعل کا مرتکب ہو، میں یقین کے ساتھ اُسے پبلک میں بُرا کہنا پسند نہیں کرتا، ہمیشہ ایسے موقعوں پر خود اپنا نفس اپنے سامنے آجاتا ہے، میں چونک اُٹھتا ہوں کہ اگر بُرا ہی کہنا ہے تو خود اپنے نفس کو بُرا کیوں نہ کہوں؟ اس سے زیادہ بُرائی کس میں ہوگی؟ بہادر شاہ کا ایک سیدھا سادا شعر ہے، جس میں شعریت کی کوئی بات نہیں، لیکن میرے دل پہ نقش ہو گیا۔

نہ تھی اپنی بُرائی پہ جب کہ نظر تو نظر میں بُرا تھا ہر ایک بشر
پڑی اپنی بُرائی پہ جب نظر تو نظر میں کوئی بھی بُرا نہ رہا

(نقشِ آزاد صفحہ ۱۳۲ مکتوب نمبر ۹۰ مورخہ ۲۲ مئی ۱۹۴۲ء)

بلاشبہ مولانا آزادؒ کا یہ مثالی کردار ان کی حیاتِ زرّیں کا ایسا روشن اور تابناک پہلو ہے جس کی نظیر کہیں نہیں ملتی، آج بعض تعلیم یافتہ حضرات کا جن کو اپنے زہد و ورع پر ناز ہے اور بزعم خویش خود کو وارثِ مسندِ رسولؐ سمجھتے ہیں، حال یہ ہے

"طنز کرتے ہیں، مرنے والوں پر"

(۱۸) مولانا آزادؒ کے طرزِ تحریر کی ایک اثر آفریں خوبی یہ ہے کہ وہ ایک رنگ کے مضمون کو سَو ڈھنگ سے باندھتے ہیں، اس قسم کی تحریریں زیادہ تر دعوت و تبلیغ اور اصلاح و تنظیم بین المسلمین سے متعلق ہوتی ہیں۔ ان تحریروں میں بحیثیت افکار و خیالات، جدت و ندرت نہیں ہوتی، صرف تکرار و اعادہ ہوتا ہے، لیکن کمال کی بات یہ ہے کہ اس نوع کی تمام تحریریں مختلف لب و لہجہ اور اسلوب و انداز کے لحاظ سے کچھ اس طرح جدّت و ندرت کی حامل ہوتی ہیں کہ قارئین باوجود تکرار و اعادہ یعنی ایک ہی قسم کے مطالب و مفاہیم کے، ہجوم اٹھتے ہیں، اور ہر مرتبہ نئی لذّت و حلاوت سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔

مولانا آزادؒ، اس طرز کی تحریروں میں نہایت دل نشین اور مؤثر پیرایۂ بیان اختیار کرکے، مسلمانوں کو ولولۂ مذہبی اور جوشِ ملّی سے سرشار کرتے تھے، اور ان کے شعلہ ہائے حیات کو فروزاں کرکے ان کے جذبات میں ہیجان اور تلاطم اس انداز سے برپا کرتے تھے کہ ان کے متحرک خون کا ہر قطرہ حرارت سے معمور ہو جائے۔

زبان و بیان اور ادب و انشاء کے لحاظ سے مولانا کی ایسی تحریریں صحیفۂ حسن و جمال ہوتی ہیں، ایک طرف تراکیب و الفاظ "روضۂ تاج" کا جمالِ آتشیں بن کر نمایاں ہوتے ہیں، تو دوسری طرف تشبیہات و تمثیلات اور استعارات اپنی پوری رعنائیوں اور دل فریبیوں کے ساتھ آئینہ کی چمک سے زیادہ درخشندہ ہو کر نظر افروز ہوتے ہیں۔

مولاناؒ نے اس طرزِ تحریر کو جس میں خیالات کی تکرار ہوتی ہے اور مطالب کا اعادہ ہوتا ہے قرآن حکیم کے طرزِ بیان سے اخذ کیا ہے، قرآن حکیم میں ایک ہی بات مختلف اسلوب اور

تکرار سے بار بار بیان کی گئی ہے، مولانا نے قرآن کے اس دل آویز اسلوب کو اس کے زور و اثر اور اعجاز کو نہایت خوبی و کمال سے جذب کر کے اپنی تحریروں اور تقریروں کے ذریعہ مختلف پیرایہ بیان کے ساتھ مسلمانوں کو بار بار مخاطب کیا ہے۔ چنانچہ الہلال مورخہ ۹ جولائی ۱۹۱۳ء میں "بارہا گفتہ ام و بار دگر می گویم" کے تحت تحریر فرماتے ہیں :-

"آپ "تکرار بیان" سے ملول نہ ہوں کہ اعلان صداقت میں کبھی بھی ندرت نہیں ہوتی بلکہ صرف تکرار و اعادہ ہی ہوتا ہے، جو چیز نئی ہے اس کی جدت سے لطف اٹھائیے لیکن صداقت جو ایک ہی ہے اور ہمیشہ سے ہے اس کے اعلان و دعوت میں جدت و ندرت کہاں سے آئے گی، سوائے اس کے کہ بار بار دہرائی جائے اور ایک ہی بیج کی مختلف موسموں میں بار بار تخم ریزی ہو، شاید کسی وقت زمین اسے قبول کر لے اور برگ و بار شجر و اثمار سے مالامال ہو جائے۔

قرآن کریم میں ایک ہی بات کا بار بار اعادہ کیا گیا ہے۔ اس کی علت پر تدبر کیجئے کہ کیا تھی؟ فرمایا کہ :-

اُنظُر کَیفَ نُصَرِّفُ الاٰیاتِ — دیکھو ہم اپنی آیتوں کو کس کس طرح پھیر پھیر کر

لَعَلَّھُم یَفقَھُون — مختلف صورتوں اور مختلف اطراف و نتائج

کے ساتھ بیان کرتے ہیں، تاکہ لوگ سمجھیں اور عقل و بصیرت حاصل کریں۔"

(۱۹) جو بات حقیقت و صداقت پر مبنی ہوتی ہے، اس کی روح میں جذب و انجذاب اور اثر و نفوذ کا قانون الٰہی مضمر ہوتا ہے اس قانون کا قدرتی خاصہ یہ ہوتا ہے کہ وہ دوسروں کو اپنی طرف کھینچے متاثر کرے اور ان کے دلوں کو موہ لے، چنانچہ مولانا کی تحریریں اور ان کی تصانیف اس قانون کی مکمل مصداق ہو کر اس قدر مؤثر اور دلپذیر ہوتی ہیں کہ پڑھنے والے یہ محسوس کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ بلاشبہ مولانا کے دل کا عشق اور باطن کا سوز و گداز ان کی زبان و قلم کے ذریعہ تحریر [illegible]
[illegible]

طریقے سے دل اثر پذیر ہوتا ہے اور اعمال و کردار پر جس دل کش طریقے سے قرآن و سنت کا رنگ نکھر آتا ہے اس کا اظہار سے اگرچہ زبان و قلم عاجز ہے، تاہم اس قدر عرض کئے بغیر چارہ نہیں کہ مولاناؒ کی تحریروں نے اُن افراد کے ذہن و فکر اور قلب و نظر میں جو مذہب سے بیگانہ اور دین سے متنفر ہو چکے تھے، ایسا ایمان افروز انقلاب برپا کیا اور ایسے حیرت انگیز طریقے سے ان کے جمود کو حرکت سے اور ان کے تعطل کو عمل سے بدل دیا جیسے ان کے مُردہ دل میں زندگی کی لہر دوڑ گئی ہو، اور وہ زبانِ حال سے نغمہ سنج ہوں :۔

زنسیمِ جانفزایت دلِ مُردہ زندہ گردد
زکدام باغے اے گُل کہ چنیں خوش ست بویت

خود طلبا اور رہبرانِ ملک و قوم نے بھی اپنے سیاسی معتقدات و آراء اور مذہبی و علمی افکار و اعمال میں مولاناؒ کی تحریرات کا اثر اس انداز سے قبول کیا، جیسے مولاناؒ نے ان کے نہاں خانۂ قلب تک رسائی حاصل کر لی ہو، اور انھوں نے اپنے دل کا دروازہ کھول دیا ہو، چنانچہ انھوں نے بذاتِ خود محسوس کیا کہ ان کی مذہبی، علمی اور سیاسی زندگی میں انقلاب و تغیّر کی لہر دوڑ گئی ہے اور ان کے اوراقِ دل کا ایک ایک صفحہ ایمان و ایقان کی روشنی سے چمک اُٹھا ہے۔

(۱۲) مولاناؒ کی تحریریں اور ان کی تصانیف اس درجہ معنی آفریں اور دل آویز ہیں کہ آپ متعدد مرتبہ ان کا مطالعہ کیجئے، بجائے اس کے کہ آپ کا ذہن گرانی محسوس کرے ہر مرتبہ ان کو قبول کرے گا اور ہر بار آپ کا ذوق نیا کیف و سرور محسوس کرے گا، نیز عبارت بھی اپنی ظاہری اور باطنی جمال آرائیوں اور حُسن افروزیوں کے ساتھ ایک نئے رنگ اور نئے پیکر میں نمایاں ہوگی۔

ہر بار نیا روپ ہے ہر بار نیا رنگ
جب دیکھئے کچھ اور ہی عالم ہے تمہارا

حضرت [illegible] کے اوصاف و خصائص تحریر کو امثال و شواہد کی روشنی میں واضح [illegible] سے آگے بڑھ گیا اس لئے مجھے [illegible]